Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

The Consciousness of Religious Observations in Iqbal's Sermons

اقبال کے خطبات میں مذہبی مشاہدے کا شعور

Rabia Sehar[1], Dr. Talib Hussain Hashmi[2]
[1]Lecturer Urdu, Government Graduate College for Women Khanewal, [2]Assistant Professor Urdu, (Adjunct), Department of Urdu, MY University Islamabad
Corresponding Email: drtalibhashmi@gmail.com

pISSN: 3007-2077
eISSN: 3007-2085

HEC approved in
Y category.

Received: 20-05-2025
Accepted: 25-06-2025
Online: 14-07-2025

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license.

Copyright: © 2025 by the author(s).

Abstract

Dr. Allama Muhammad Iqbal's consciousness was in the period of maturity, at that time the world had been confronted with the horrors of the Industrial Revolution and the First and Second World Wars. This was the period when the destiny of man was conditioned by materialism. For this, religion, Sufism or spirituality were becoming like crutches. On the one hand, the monster of increasing mechanized life and materialism was rapidly swallowing religious and spiritual values, while on the other hand, because of the efforts of economic revolutionaries like Karl Marx and Lenin, the world was becoming aware of a new system of government. In such a situation, Iqbal emerged as a mujtahid, philosopher and theologian and presented his thoughts and ideas regarding the new understanding of Islam in seven English sermons, which were later published in book form under the title "The Reconstruction of Religious thought in Islam".

Keywords:
Iqbal's consciousness, Religious Observation, Iqbal's Sermons,

علامہ محمد اقبال برصغیر کے ان عظیم مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اسلامی فکر کو جدید علمی و فلسفیانہ تناظر میں نہ صرف پیش کیا بل کہ اس کی تعبیرِ نو کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ان کے خطبات بالخصوص "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں مذہب، سائنس، فلسفہ اور تصوف کے باہمی تعلق پر گہرے مباحث ملتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک مذہب کی اصل بنیاد مذہبی مشاہدے اور تجربے پر قائم ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ مذہبی شعور انسانی شعور کی اعلیٰ ترین سطح ہے جس میں حقیقتِ مطلقہ سے براہِ راست رابطہ قائم ہوتا ہے۔

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

اقبال نے مذہبی مشاہدے کو وجدانی و باطنی واردات کی حیثیت دینے کے ساتھ ساتھ اس کی علمی و سائنسی توثیق بھی کی ہے۔ انھوں نے مغربی فلسفیوں کی اس رائے کو چیلنج کیا کہ مذہبی تجربہ صرف ایک ذاتی اور غیر علمی واردات ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ جس طرح حسی تجربے سے مادی حقائق تک رسائی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح مذہبی مشاہدہ ماورائی حقائق کی معرفت عطا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا سرچشمہ یہی زندہ اور تخلیقی تجربہ ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو نئی روح عطا کرتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ ''اقبال کے خطبات میں مذہبی مشاہدے کا شعور: تحقیقی و توضیحی مطالعہ'' اسی تصور کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس مطالعے میں اقبال کے مذہبی تجربے کے تصور کے بنیادی خدوخال، فکر و وجدان کے باہمی تعلق، مذہبی مشاہدے کی علمی و سائنسی اساس اور اس کے عملی و روحانی اثرات کا تحقیقی و توضیحی تجزیہ کیا گیا ہے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اقبال کے نزدیک مذہبی مشاہدہ اسلامی فکر کی احیائی تحریک کا نہایت بنیادی اور لازمی جزو ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا شعور جس دور میں پختگی کی جانب مائل ہوا، اُس وقت دنیا صنعتی انقلاب اور جنگِ عظیم اوّل و دوم کی ہولناکیوں سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب انسان کی منزلِ مقصود مادہ پرستی سے مشروط ہو چکی تھی۔ اس کے لیے مذہب، تصوف یا روحانیت بیساکھیوں کی سی وقعت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جانب بڑھتی مشینی زندگی اور مادہ پرستی کا عفریت تیزی سے مذہبی و روحانی اقدار کو نگل جا رہا تھا تو دوسری جانب کارل مارکس اور لینن جیسے معاشی انقلابیوں کی کوششوں کے نتیجے میں دنیا نئے نظامِ حکومت سے روشناس ہو رہی تھی۔ ایسے دور میں مسلمان، جو اپنے مرکز و محور یعنی اسلام سے بڑی حد تک دور تھے اور اپنی سیکڑوں سالوں کی نااہلیوں کی وجہ سے کہیں جسمانی اور کہیں ذہنی غلامی کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کا یورپی تہذیب کی چکاچوند کے آگے اپنی بچی کھچی مذہبی و روحانی اقدار سے مزید دور ہو جانا اور اس کے سحر میں گرفتار ہو کر اس کی جانب کھنچے چلے جانے کے روشن ترین امکانات بھی موجود تھے۔

ایسے میں جب کہ وہ رائج علم کلام جو کئی صدیوں سے مسلمانوں کے سر کا تاج رہا تھا، عصری تقاضوں سے اس کی تطبیق غیر مناسب ہو گئی تھی۔ دوسری جانب مغربی یلغار کے نتیجے میں عقلیت پرستی کی روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس لیے بھی اس بات کی ضرورت کو بہت زیادہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب اسلام میں ایسے متکلمین و فلاسفہ ابھریں جو

عہدِ حاضر کے مطابق ہی دین کے دائرے میں رہتے ہوئے مذہب کی نئی پرکھ، نئے تجربات، نئے امکانات اور نئے مسائل و سوالا ت کے جوابات دینے کے قابل ہوں۔ ایسے میں دانائے راز، مفکر ملت علامہ محمد اقبال ایک مجتہد، فلاسفر اور متکلم کی صورت میں جلوہ گر ہوئے اور اسلام کی تفہیمِ نو کے حوالے سے اپنے افکار و خیالات سات انگریزی خطبات میں پیش کیے جو بعد ازاں کتابی صورت میں بعنوان ''The Reconstruction of Religious Thought in Islam'' شائع ہوئے۔

> ”علامہ نے Knowledge سے علم بالحواس مراد لیا ہے، اسی علم کی ترقی یافتہ صورت کو وہ فکر یا فلسفہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ فکر کی ترقی یافتہ صورت ان کے نزدیک ”وجدان ہے اور وجدان وہی ہے جسے علامہ اقبال Religious Expereince اُسے بھی تعبیر فرماتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر میں علم حسی تجربے پر مبنی ہو تو سائنس ہے عقل پر مبنی ہو تو فکر وفلسفہ ہے اور اگر اس کے حصول کا ذریعہ قلب ہو تو یہ Religious Experience ہے۔“(۱)

اقبال مذہب اور سائنس دونوں کو ایسا علم قرار دیتے ہیں جو تجربے پر مبنی ہے، دونوں میں فرق وسائل کا ہے۔ ایک کا وسیلہ ادراک ”حواس ہیں اور دوسرے کا وسیلہ حصول ”قلب“ ہے۔

> ” اقبالؒ کے نزدیک مذہبی تجربہ دراصل وہ باطنی مشاہدہ اور وجدانی آگہی ہے جو انسان کو مادی حواس کی محدود سرحدوں سے نکال کر ایسے عوالمِ غیب کی سیر کراتی ہے جہاں عشق کی روشنی میں حقیقت کے وہ اسرار واہوتے ہیں جو عقلِ محض کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہ تجربہ انسان کی روح کو ایک ایسی معرفت عطا کرتا ہے جس کے طفیل اس پر کائنات کی باطنی معنویت اور اس کی اپنی ذات کا حقیقی مقصود منکشف ہونے لگتا ہے۔ اقبالؒ اسے ہی مذہبی شعور کی معراج قرار دیتے ہیں کہ اس کے بغیر علم محض الفاظ کا ہجوم رہ جاتا ہے اور زندگی بے روح قالب کی مانند ہو جاتی ہے۔“(۲)

ڈاکٹر اقبال کے مطالعے میں بہت وسعت تھی جس کا اندازہ ان کے خطبات میں بیان کیے گئے مشرق و مغرب کے فلاسفہ اور ان کے افکار و کتب وغیرہ کے ذکر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے عصری تقاضوں کے مطابق ایمانیات کی تفہیم کی کوشش کی نہ کہ اپنے افکار کو دوسروں کے سروں پر تھوپنے کی کوشش۔ اس تفہیم کے ابلاغ کے لیے انھوں نے دو ذرائع استعمال کیے جن میں پہلا ذریعہ ان کی شاعری ہے جس کے مخاطب عام طور پر عوام الناس ہے جب کہ دوسرا ذریعہ مذکورہ خطبات ہیں جن کے مخاطب خواص ہیں۔ گو کہ شاعری میں بھی ان کے حکیمانہ و فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ خطبات ہی ان کی فکر کا اصل نچوڑ ہیں۔

علامہ محمد اقبال نے یہ خطبات مدراس، بنگلور، میسور، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ میں سیٹھ جمال احمد کی دعوت پر پیش کیے۔ خطبات کے پس منظر کے حوالے سے فرزندِ اقبال ”خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم“ میں یوں رقم طراز ہیں:

> ”اسلامی فکر کی تشکیل نو پر اپنے گراں قدر خطبات علامہ اقبالؒ نے جنوری ۱۹۲۹ء میں مسلم ایسوسی ایشن مدراس کی دعوت پر مدراس میں پیش کیے۔ یہ سلسلہ محض مدراس تک محدود نہ رہا بلکہ حیدرآباد دکن اور علی گڑھ تک پھیل گیا جہاں بھی ان کے افکار کی گونج سنائی دی۔ دراصل اس دعوت کی بنیاد علامہ کے اس مقالے پر پڑی جو انہوں نے

"**اجتہاد** " کے موضوع پر ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں شیخ عبدالقادر کی صدارت میں پڑھا تھا۔ اس مقالے کی گونج جب اخبارات کے ذریعے مدراس پہنچی تو مسلم ایسوسی ایشن مدراس کے سرکردہ رہنما سیٹھ جمال احمد نے علامہ اقبال کو مدعو کیا کہ وہ آکر اسلامی فکر کے جدید تقاضوں پر خطبات ارشاد فرمائیں، تاکہ وہاں کے دانشور طبقے کو بھی ان کے تازہ فکر و نظر سے فیض پہنچے۔"(۳)

خطبات کی اشاعت ۱۹۳۰ء میں ہوئی لیکن اس وقت ان خطبات کی تعداد چھ تھی۔ ۱۹۳۴ء میں اس میں ایک اور خطبے "کیا مذہب کا امکان ہے؟" کا اضافہ کر دیا گیا اور پھر سے اشاعت ہوئی۔ جس کے بارے میں ان خطبات کے اولین ترجمہ نگار و شارح سید نذیر نیازی کہتے ہیں:

"۱۹۳۴ء میں بعض لفظی ترمیمات اور ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ جسے ارسطو ٹی لین سوسائٹی لندن Aristotelian Society, London کی دعوت پر لکھا گیا، آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام طبع ہوا۔"(۴)

"چوں کہ خطبات میں ایک اور خطبے کا اضافہ ہو چکا تھا اس لیے کتاب کے سرورق سے "Six Lectures" کے الفاظ حذف کر دیئے گئے۔ خطبات کے پسِ منظری مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال کے کسی اچانک یا جذباتی خیال کا نتیجہ نہ تھے بل کہ ان کی تیاری میں انھیں پانچ سال کا عرصہ لگا۔"(۵)

یہ پانچ برس ان کی سوچ و بچار کے نتیجے میں جنم لینے والے نئے افکار کا نتیجہ ہو سکتے ہیں جب کہ حقیقتاً وہ اسلام کا مطالعہ بچپن ہی سے کر رہے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی زیست کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ قرآن پاک کا مطالعہ بچپن سے ہی ان کی عادات میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے والد محترم شیخ نور محمد کی انھیں یہ نصیحت کہ قرآن اس طرح پڑھو جس طرح یہ تم پہ نازل ہو رہا ہو، اس بات کی یقین دہانی کراتا ہے کہ وہ ایک دم سے تصوف کی جانب مائل نہیں ہوئے بل کہ اوائل عمری سے ہی اسلامی تعلیمات ان کے معمولات میں شامل رہی تھیں۔ پھر ان کی بیٹھک میں علمی و ادبی مجالس کا وہ سلسلہ جس کے منتظم ان کے والدِ محترم تھے اور محفلین میں پائے کے علما، بزرگ اور مشائخ ہوتے تھے، ان سب نے بھی انھیں ماورائیت اور مابعد الطبیعات یا بالفاظِ دیگر تصوف کی جانب کھینچا۔

یہی وجہ ہے کہ سفر یورپ اور وہاں حصولِ علم کے دوران یورپی سائنسدانوں کے نظریات اور فلاسفہ کے فلسفے بھی ان کے ایمان کی بنیادیں ہلا نہ سکے۔ ڈاکٹریٹ کے لیے بھی ان کے مقالے کا انتخاب ماورائیت کے حوالے سے ہی تھا جس سے ان کے خطبات کے پس منظری مطالعے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔ در حقیقت، ان کے اشعار کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک جانب مغرب کی نئی تہذیب سے نالاں تھے تو دوسری جانب ان کے سامنے مسلمانوں کی روحانی اقدار کے ڈوبتے بیڑے کو بچانے کا عزم تھا، یہی اسباب

خطبات کی تشکیل کا سبب بنے۔

ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر نئی نسل کے وہ مسلمان تھے جو فکری اور کئی حوالوں سے جسمانی طور پر بھی مغرب کی غلامی قبول کر بیٹھے تھے یا پھر اپنی مسلسل مشکلات وشکست وریخت کی بدولت یورپی آقاؤں کی تہذیب وتمدن کو ہی کامیابی کے لیے حرفِ آخر سمجھ بیٹھے تھے اور اسی سبب اسلام سے دور بھی ہو رہے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسلام کی تعبیرِ نو کے لیے مسلمانوں کی نئی نسل کے سامنے مغرب ہی کے طرزِ تفکر واستدلال کو اپناتے ہوئے اس دور یا دورِ حاضر میں بھی اسلام کی قبولیت اور اہمیت کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن اس کا ہر گز مطلب یہ بھی نہیں کہ انھوں نے اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش کی یا اس میں تحریفات یا ترمیمات کی کوشش کی ہو۔

اقبال نے حصولِ علم کے تین ذرائع بیان کیے ہیں عقل، حواس اور وجدان۔ عقل کے ذریعے حاصل شدہ علم کو عقلی علم کہا جاتا ہے۔ عقلی علم کا ماہر عالم کہلاتا ہے۔ حواس کے ذریعے حاصل کیے جانے والے علم کو مشاہداتی تجرباتی علم کہا جاتا ہے اس کا ماہر سائنسدان کہلاتا ہے۔ جو علم وجدان کے ذریعے سے حاصل ہوا سے معرفت کہا جاتا ہے اور اس علم سے آگہی رکھنے والا عارف کہلاتا ہے۔ اقبال عقل یا حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم اور وجدانی علم میں تمیز کرتے ہیں لیکن ان کے پہلے خطبے میں مجموعی طور پر عقل، حواس اور وجدان سے حاصل کیا گیا علم ہے۔

بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

> ”اُنھوں نے اصطلاح روحانی تجربہ کے بجائے مذہبی تجربہ استعمال کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں مذہبی تجربہ کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے اور ایسا تجربہ درجات کے اعتبار سے اوّل تو وحی یا الہام کی صورت میں ہے پیغمبر یا نبی کے لیے وقف ہے۔ دوم کشف کی صورت میں ولی کے لیے اور سوم القا کی صورت میں شاعر کے لیے۔ مگر قطع نظر درجات کے تجربہ کی نوعیت مذہبی یا خدا کے حوالے سے ہو۔“[۶]

> ”خطبے کی ابتدا میں، علامہ اقبال نے چند سوالات اٹھائے ہیں جو پیشِ خدمت ہیں۔
>
> ۱۔ اس جہان کی ساخت اور ڈھانچہ کیا ہے جہاں ہم رہتے ہیں؟
>
> ۲۔ کیا اس جہان کی تعمیر تشکیل میں دوامی یا ہمیشگی کا کوئی عنصر موجود ہے؟
>
> ۳۔ اس جہان سے ہمارا کیا تعلق ہے؟۔ اس جہان میں ہماری حیثیت اور اس حیثیت کے حوالے سے ہمارا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟۔“[۷]

پہلا سوال

یہ عالم، جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، دراصل کس نوعیت کا حامل ہے؟ اس کی ساخت اور حقیقت کیا ہے؟ دوسرے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

لفظوں میں، یہ کس طور پر سرگرم عمل ہے اور اس کا مزاج و کردار کیا ہے؟

علامہ اقبالؒ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ کائنات کسی جامد و ساکت حقیقت کا نام نہیں، نہ ہی یہ کوئی ایسا تیار شدہ فن پارہ ہے جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو اور اب اس میں کسی تبدیلی یا حرکت کی گنجائش نہ ہو۔ یہی تصور غالبؔ نے بھی اپنے منفرد اسلوب میں کچھ یوں بیان کیا تھا:

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں(۸)

چوں کہ خطبات کا اسلوب اس قدر آسان نہ تھا۔ علامہ اقبال کی باتیں با آسانی من و عن سمجھ آجائیں اس لیے ان کی تفہیم کی کوششوں کا آغاز اقبال کی زندگی کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں اولین اور اہم ترین نام سید نذیر نیازی کا آتا ہے جنھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ بہت سی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا اور ان خطبات کے ترجمہ کو انھیں دکھایا بھی اور اس میں کچھ ترامیم بھی کروائیں۔

سید نذیر نیازی نے خطبات کے ترجمے کو اہم وضاحتوں کے ساتھ "تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ" کے عنوان سے ترتیب دیا۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔ یوں ان خطبات کی تفہیم کے سلسلے میں یہ پہلی کوشش ثابت ہوئی جس کی روایت علامہ اقبال کی زندگی میں ہی چل نکلی تھی۔

کتاب میں شامل خطبات جو دینِ حق کی ہمہ گیر تعمیر و تعبیرِ نو کے مترادف ہیں، ان کے موضوعات "علم اور مذہبی تجربہ"، "مذہبی تجربے کے انکشاف کی فلسفیانہ پرکھ"، "خدا کا تصور اور عبادت کا مفہوم"، "انسانی خودی، اسکی آزادی اور بقا"، "مسلم ثقافت کی روح"، "نظامِ اسلام میں حرکت کا اصول"، "کیا مذہب کا امکان ہے؟" چونکا دینے والے تھے اس لیے انھوں نے جلد ہی مبصرین و شارحین کی توجہ حاصل کر لی اور ان پر بحث کا آغاز ہو گیا لیکن یہ سلسلہ جلد ہی جان توڑ گیا کہ یہ ایک مشکل کام تھا۔ نتیجتاً لوگوں کی ساری توجہ اقبال کی شاعری کی جانب ہی مبذول ہو کر رہ گئی۔

> "درحقیقت، علم انسان کے ذہنی ارتقا کی وہ جدوجہد ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول، یعنی مادّی کائنات کی حقیقت کو درست طور پر سمجھنے کی سعی کرتا ہے۔ علم محض ایک تصور نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے، اور اس حقیقت تک رسائی کا ذریعہ تجربہ ہے۔ یعنی علم دراصل کسی شے کے شعور اور اس کے عملی ادراک کا نام ہے، جس کے بغیر حقیقت محض ایک مبہم خیال بن کر رہ جاتی ہے۔"(۹)

> "اقبال کی نظر میں انسان اور خدا میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک ظاہر ہے اور دوسرا باطن۔ خدا کی تلاش انسان کی تلاش ہے اور انسان کی تلاش خدا کی تلاش کے ہم معنی ہے۔ علامہ محمد اقبال اور شیخ محی الدین ابن عربی

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

کے مذکورہ خیالات میں کامل یکسانیت ہے اور دونوں ہی خیالات کفر اور شرک کی گندگی سے آلودہ ہیں۔"(۱۰)

"عہدِ حاضر کا سب سے نمایاں اور فکر انگیز پہلو یہ ہے کہ فکری لحاظ سے عالمِ اسلام تیزی سے مغرب کی جانب مائل ہو رہا ہے۔ اصولاً اس رجحان میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ علم و حکمت کے اعتبار سے مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض گوشوں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ تاہم اصل خدشہ یہ ہے کہ کہیں اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور فریبِ حسن ہماری بصیرت کو اس قدر مرعوب نہ کر دے کہ ہم اس کے باطنی جوہر، حقیقی روح اور اصل معنویت تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔"(۱۱)

جب کہ اس سے قبل علامہ محمد اقبال کتاب کے دیباچے میں یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ ان کی اس کوشش کو حتمی نہ سمجھا جائے بل کہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے رہنے کی کوشش بھی جاری رکھی جائے۔ علامہ اقبال کی جدید فزکس اور اس کے نظریات کے حوالے سے مذہب کے پیچھے رہ جانے اور لوگوں کے اس سے دور ہو جانے کے خدشات عین درست تھے۔ ان کے خطبات کے اسباب بھی بالکل واضح تھے اور اس حوالے سے ان کی تشویش ان کی فکر بھی۔ اس سب کے باوجود انھوں نے اپنے فکر و فلسفے کو حتمی اور دائمی قرار دے کر پہلو تہی نہیں کی بل کہ ان خطبات کو اس راہ میں پہلا قطرہ قرار دے کر صلائے عام ہے یارانِ نقطہ داں کے مقولے پر عمل کیا۔

علامہ اقبال کی نگاہ میں کائنات کی تشکیل ایسے ہوئی ہے کہ یہ قابل توسیع ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کے ہاتھوں میں مکمل طور پر تسخیر ہونے کا عہد رکھتی ہے۔ ایک آیت یہ ہے:

"یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ"

"وہ تخلیق میں جس قدر چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے"۔

اس آیت مبارکہ کی تشریح ایک شعر میں یوں کرتے ہیں:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دَما دَم صدائے 'کن فیکون'(۱۲)

دوسرا سوال

کیا اس کائنات کی ساخت میں کوئی ایسا عنصر بھی موجود ہے جو دائمی حیثیت رکھتا ہو؟ یعنی کیا تخلیق کائنات میں کوئی ایسی مستقل حقیقت بھی ہے جس کا ذوقِ ظہور اس کے ہر ذرّے میں محوِ تماشا ہے؟

علامہ اقبالؒ اس سوال کا نہایت دلنشیں جواب دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہاں، ایک ایسا عنصر ضرور ہے جو کائنات کی تشکیل میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اور وہ عنصر انسان ہے۔ انسان ہی وہ حقیقت ہے جو اپنی مسلسل جدوجہد، سعیِ پیہم، اور تخلیقی عمل کے ذریعے

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

اس کائنات کو نت نئے رنگ عطا کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ذات کی انفرادی چھاپ کائنات کے ہر گوشے پر ایسی پختہ اور اَنمٹ صورت اختیار کر لیتی ہے جو اسے ایک ابدی معنویت عطا کرتی ہے۔

تیسرا سوال

انسان کا کائنات میں مقام کیا ہے اور اس مقام کے لحاظ سے اس کا طرزِ عمل کیسا ہونا چاہیے؟

اقبالؒ کے نزدیک انسان اس کائنات میں خلیفۃ اللہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زمان و مکان کی وسعتیں انسان کے لیے مسخر کی گئی ہیں، گویا کائنات کی ہر شے اس کے سامنے سراپا تسلیم و رضا بنی ہوئی ہے۔ لیکن اس عظیم منصب کے تقاضے یہ ہیں کہ انسان مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرے، ان میں پوشیدہ قوانین کو سمجھے، اور ایسے ذرائع دریافت کرے جن کے ذریعے تسخیرِ کائنات کا یہ عمل ایک ٹھوس اور عملی حقیقت بن سکے۔ اقبالؒ کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی تہذیب پر یونانی فکر و فلسفہ کی گہری چھاپ رہی ہے، اس لیے کہ اسلام سے قبل انسانی علمی تاریخ میں یونانی فلسفے کا غلبہ مسلم تھا، اور اس کے اثرات نے مسلم مفکرین کی فکری تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

"علم اور مذہبی مشاہدہ یا تجربہ" کے حوالے سے جن مباحث کا آغاز کیا ہے ان میں علم کے ذرائع اور روحانی مشاہدات دو اہم ترین موضوعات ہیں۔ اس خطبے کا اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں انھوں نے انسانی دماغ میں آنے والے چند بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور پھر ایسے ہی سوالات کے جوابات کی تلاش میں فکر و فلسفہ اور مذہب کو بنیاد بناتے ہوئے ان کے ارتباط و اختلافات کی نشاندہی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے جوابات مذہب اور وجدان دونوں سے ہی ممکن ہیں۔

عام مشاہدہ ہے کہ بچہ آنکھ کھولتا ہے تو وہ ہر شے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کی نظر میں ہر شک ایک دلچسپی کا سامان بنتا ہے۔ شعور کی ذرا سی پختگی کو پہنچتے ہی وہ چاند کو اپنے ساتھ چلتا محسوس کرتا ہے، پھول پودے اسے اچھے لگتے ہیں اور یوں وہ مظاہرِ فطرت کی جانب کھنچا چلا جاتا ہے۔ ان سے جس قدر اس کی قربت ہوتی چلی جاتی ہے، اس پر رازِ حیات منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اسی سبب کئی لوگ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ موجود کے بارے میں بھی سوالات اٹھانے لگتے ہیں۔ شعور کی بلوغت کو پہنچتے ہی انسان میں ویسے سوالات جنم لینے لگتے ہیں جیسے سوالات زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کے ذہن میں جنم لینے چاہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ کائنات کیا ہے؟ فرد کی اس میں کیا حیثیت و مقام ہے؟ کیا وہ اس کا ایک جز ہے اور اگر ہے تو کل کیا ہے؟ ہم کسی خدا کو کیوں مانیں؟ کیا سیکڑوں، ہزاروں سالوں پرانا مذہب اور اس کے نظریات اس دور میں بھی قابلِ قبول ہیں یا پھر انسانی فکری ترقی ان نظریات سے آگے نکل کر ایسے مسلمہ اصول قائم کر چکی ہے جس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں؟ کیا حتمی سچائی کی تلاش میں خدا سے ہمکلام ہوا جا سکتا ہے یا اپنے معبود سے ملاقات

ہو سکتی ہے ؟ یا پھر عبدیت کی معراج کیسے حاصل کی جائے ؟ انسانی خود مختاری کیا ہے اور اس کا استعمال کیا ہے ؟ اور اس جیسے دیگر بے شمار سوالات انسان کے خیالات کی آماجگاہ بنتے ہیں۔ بالخصوص ترقی یافتہ اور اپنے قوتِ بازو پر بھرپور انحصار کرنے والی قوموں کے ذہنوں میں یہ سوالات زیادہ شدت کے ساتھ گونجتے ہیں۔

ایسے میں جس نسبت سے قومیں ترقی کر رہی ہوتی ہیں، اس نسبت سے اگر مذہب ترقی نہیں کرتا یا دوسرے الفاظ میں علماء و مشائخ جدید تقاضوں کے پیش نظر مذہب کی تفہیم و ترویج میں فیل ہو جاتے ہیں تو مذہب اور مادی ترقی (سائنس) میں پیدا ہونے والے اختلافات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے مطابق یہ ایک رائج خیالِ غلط ہے کہ سائنس اور مذہب کا یا مذہب کا عقلیت سے کوئی سروکار نہیں۔ حقیقتاً عہد گزشتہ میں مسلمان سائنسدانوں نے، جن کی آنکھیں اور دل مذہب کی روشنی سے منور تھے، انھوں نے ایسے گراں قدر کارنامے سرانجام دیے کہ آج جدید دنیا بالخصوص یورپ کی ترقی انھی کی مرہونِ منت دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب مسلمان بھی علم کے ساتھ ساتھ عمل پر کاربند رہے اور اسی لیے دنیا میں مقام و مرتبہ پایا۔

اسی فہمِ ذات و کائنات کے حوالے سے علامہ اقبال اپنے خطبہ اول میں ایسے بنیادی سوالات اٹھاتے ہیں کہ اس کائنات کی اہمیت، خوبیاں، مقصد اور ساخت کیا ہے جس میں ہمارا بسیرا ہے۔ کیا یہ ابدی ہے یا اس کی ساخت میں کوئی مستقل عنصر موجود ہے؟ ہمارا اس سے تعلق کیا ہے اور اس میں ہمارا حصہ و مقام کیا ہے؟ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ اقبال کے بقول یہ سوالات مذہب، فلسفہ، شاعری میں عام ملتے ہیں جب کہ شاعری میں ان کی نوعیت ذرا ادنیٰ درجے کی ہو سکتی ہے، فلسفے میں اس سے بہتر اور مذہب میں بہترین۔

اب ان سوالات کے جوابات جاننے کے لیے بھی یہی تینوں ذرائع استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہمیں بہت سے سوالات کے جوابات شاعری سے ملتے ہیں، بہت سے جوابات فلسفے سے اور بہت سے جوابات مذہب سے۔ حقیقتاً ان سب سوالات اور ان جیسے دیگر مابعد الطبیعاتی سوالات کے جواب سائنس کے پاس موجود نہیں کہ یہ نہ تو فلسفہ ہے اور نہ ہی مذہب۔ البتہ سائنس سوائے مذہب کے، فلسفہ اور شاعری، دونوں کو متاثر کرنے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی طریقہِ تحقیق میں تشکیک ہی اولین شے ہے جو بڑی خوبی سے کسی بھی نتیجے تک پہنچانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

اقبال کا استدلال یہ ہے کہ جہاں ان سوالات کے جوابات فلسفے اور شاعری سے کسی حد تک مل سکتے ہیں، وہیں ان کے جوابات

بہترین انداز میں مذہب سے مل جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب اپنی ہر صورت میں قابلِ قبول ہے اور کیا یہ آفاقی ہے؟ اگر آفاقی ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم میں کسی قسم کا تغیر ہونا چاہیے یا نہیں۔ ان سوالات کے جواب اثبات میں ہیں۔

علامہ اقبال نے علم کے ذرائع میں سے وجدان کو بہت اہمیت دی ہے کہ یہ سوچ اور تفکر کی پرواز کو بلند کرتا ہے اور اسے بہت دور لے جاتا ہے۔ اُنھوں نے وجدان کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ عقل بے سمت پرندہ ہے اور وجدان جب مذہب کے دائرے میں داخل ہوتا ہے تو یہ لاینحل معموں کو بڑی تیزی اور آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ وجدان سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ایک مذہبی تجربہ جس کے متحمل عام انسان، اولیاء اور صحابہ تک نہیں ہوسکتے بل کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص ترین بندوں کو منتخب کر کے نبوت عطا کرتا ہے، وحی ہے۔ وحی اور وجدان دو مختلف مابعد الطبیعیاتی مظاہر ہیں لیکن دونوں ہی کا تعلق مذہب اور روحانیات سے ہے۔ وحی کا ذریعہ علم ہونے پر کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ اس کے ذریعے دنیا و آخرت کی وہ معلومات اور راہنمائی مہیا کی گئی ہے جو جدید دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔

> ”مذہب فلسفہ کا کوئی شعبہ نہیں، کیوں کہ یہ محض فکر ہے، نہ احساس، نہ عمل، بل کہ انسان کی ذات کلی کا مظہر۔ لہٰذا فلسفہ مجبور ہے کہ مذہب کی قدر و قیمت کے باب میں اس کی مرکزی حیثیت کا اعتراف کرے۔ اسے ماننا پڑے گا کہ فکر انسان کا عمل ترکیب و استلاف مرتکز ہوتا ہے تو اس ایک نقطے پر۔“(۱۳)

علامہ اقبالؒ کے نزدیک بعض مسلمان مفکرین نے قرآن کی حکمت کو اس کی اصل روح کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہ کی، بلکہ انہوں نے یونانی فلسفے کے پیمانوں پر قرآن کو پرکھنے کی روش اختیار کی۔ اس فکری انحراف کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں مختلف مکاتبِ فکر کا ظہور ہوا جن پر مجموعی طور پر یونانی فکر کا غلبہ رہا۔ انہوں نے ہر حقیقت کو یونانی عقل و منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی، جس سے فکری الجھنیں پیدا ہوئیں۔

اسی تناظر میں اقبالؒ نے اپنے خطبے میں دو متقابل گروہوں پر بحث کی: معتزلہ اور اشاعرہ۔ معتزلہ خالصتاً عقلیت پسند تھے اور یونانی منطق کے دلدادہ، جبکہ اشاعرہ کے نزدیک محض عقل کافی نہ تھی۔ اقبالؒ کی نظر میں اشاعرہ کا نقطہ نظر زیادہ تعمیری تھا اور وہ معتزلہ کے مقابلے میں صراطِ مستقیم پر تھے۔

علامہ اقبالؒ نے یونانی فلسفے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے امام غزالیؒ کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ جس طرح نبی کریم ﷺ نے کفر و شرک کے ماحول میں کلمہ حق بلند کیا، اسی طرح امام غزالیؒ نے فلسفے اور عقلیت پسندی کے سیلاب کے مقابل اپنا اصلاحی کردار ادا کیا۔ اقبالؒ کے مطابق عقلیت پسندی کے خلاف امام غزالیؒ کی جدوجہد کا کردار فلسفی کانٹ کے اس کردار کے مترادف ہے جو اس نے جرمنی

میں انتہا درجے کی عقلیت پسندی کے خلاف ادا کیا۔

کانٹ اگرچہ حسی علم پر تنقید کرتا ہے اور عقلی علم کو ناقص قرار دیتا ہے، مگر وہ خدا کے وجود تک پہنچنے کے امکان کو رد کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس امام غزالیؒ نے جب دیکھا کہ عقل دینی حقائق تک رسائی میں ناکام ہے تو انہوں نے صوفیانہ تجربے کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں انہیں مذہب کی آزاد اور مستقل حیثیت کا ادراک ہوا، جس سے یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ مذہب اپنی ذات میں سچا اور سائنس و مابعد الطبیعات سے ماوراہے۔

صوفیانہ مشاہدات پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ انسانی تاریخ صوفیانہ اور روحانی ادب سے بھری پڑی ہے۔ اپنے خطبے میں انہوں نے صوفیانہ مشاہدات کی پانچ بنیادی خصوصیات بیان کی ہیں، جن کا مختصر خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ علامہ اقبال کے نزدیک صوفیانہ تجربے کی پہلی خصوصیت اس کا براہِ راست ہونا ہے یعنی صوفی کے تجربے کی تیزی اور سرعت اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہونے اور اس کے قرب کا احساس اسے آناً فاناً گھیر لیتا ہے۔

> "اللہ عزوجل کی ذات وہ برتر حقیقت ہے جو صاحبِ حال پر اچانک ایک عظیم انکشاف یا غیر معمولی حقیقت کے طور پر آشکار ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک صوفیانہ تجربہ بھی دیگر انسانی تجربات کی طرح ایک حقیقی تجربہ ہے۔ جس طرح عام تجربات میں انسان حسی ادراک کے ذریعے خارجی دنیا کے حقائق جانتا ہے، اسی طرح صوفیانہ تجربے کے ذریعے انسان حقیقتِ مطلقہ، یعنی ذاتِ خداوندی کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ یہ تجربہ انسان کو وہ بصیرت عطا کرتا ہے جو محض عقل و استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتی۔"[۱۴]

۲۔ اقبالؒ صوفیانہ تجربے کی دوسری خصوصیت یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ تجربہ اپنی ماہیت میں ناقابلِ تجزیہ وحدت رکھتا ہے۔ یعنی صوفیانہ مشاہدہ ایک ایسا ہمہ گیر کل ہے جسے اجزا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اقبالؒ میز کی مثال دیتے ہیں کہ جب ہم کسی میز کو دیکھتے ہیں تو اگرچہ ہمارا تجربہ بے شمار حسی تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن ہم ان تاثرات کو الگ الگ تجزیے کے ذریعے بیان نہیں کر سکتے۔ ہم میز کو بحیثیت ایک اکائی کے دیکھتے ہیں، اور اس دیکھنے میں وقت، مقام اور کیفیت کے کئی پہلو شامل ہوتے ہیں، مگر یہ سب ہمارے شعور میں ایک ناقابل تقسیم وحدت کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی طرح، اقبالؒ فرماتے ہیں کہ صوفی کے روحانی تجربے کی بھی یہی نوعیت ہے۔ اس کے لیے اس کا مشاہدہِ حقیقت ایک ایسی وحدت رکھتا ہے جس کا منطقی یا تحلیلی تجزیہ ممکن نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے حسن و جمال یا دل کی لطیف کیفیات بعض اوقات بیان اور تجزیے سے بالاتر ہو جاتی ہیں، صوفیانہ تجربہ بھی انسانی شعور پر ایک بے پناہ، ناقابلِ تقسیم حقیقت کی طرح وارد ہوتا ہے۔

۳۔ علامہ اقبال صوفی تجربے کی تیسری خصوصیت کو یوں بیان کرتے ہیں: صوفی کے لیے صوفی کی حالت کسی اور بے مثال وجود سے قربت اور جدائی کا ایک لمحہ ہے جہاں اس کی اپنی شخصیت عارضی طور پر کھو جاتی ہے۔ تاہم اقبال فرماتے ہیں کہ اس دشمنی کو اس تجربے کی حقیقت کو کم کرنے کے لیے دلیل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ایسی دشمنی اور نقصان کی مثالیں سائنس اور دیگر شعبوں میں بھی ملتی ہیں۔ بل کہ یہ دشمنی خدا کی ذات کے اثبات کی دلیل ہے کیوں کہ ایک غیر حقیقی چیز اس طرح کسی حقیقی چیز پر غالب نہیں آ سکتی۔

> "علامہ اقبال کے نزدیک صوفیانہ تجربے کی چوتھی امتیازی خصوصیت اس کا براہِ راست اور بلاواسطہ ہونا ہے۔ جب سالک پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ اس امر سے تو آگاہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی غیر معمولی واردات رونما ہوئی ہے، تاہم اس واردات کی نوعیت، اس کا منبع، اور اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے بیان کی قدرت و استطاعت اس میں نہیں رہتی۔ یہ تجربہ محض خیالی یا نظری نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ یہ احساس اور ادراک کی ایک لطیف ترین صورت ہے جو براہ راست وجدان کی سطح پر وارد ہوتی ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ خالصتاً احساس کی ایک کیفیت معلوم ہوتی ہے، مگر درحقیقت اس میں علم و آگہی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ صوفیانہ تجربہ، علم کی وہ لطیف ترین اور دقیق ترین جہت ہے جس میں ادراک، جذبہ اور وجدان سب یکجا ہو جاتے ہیں۔"(۱۵)

۴۔ علامہ اقبال کے نزدیک صوفیانہ تجربے کی پانچویں نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ جب سالک پر قربِ الٰہی کا شعور غالب آتا ہے تو اس کی نگاہ میں روز و شب، زمان و مکان اور دنیوی سلسلے محض ظاہری مظاہر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ اسے یہ کائناتی مظاہر بے حقیقت محسوس ہونے لگتے ہیں، تاہم اس کا رشتہ زمان و مکان سے مکمل طور پر منقطع نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود کہ اس کا قلب و روح ایک ایسی انوکھی اور عظیم الشان کیفیت سے سرشار ہوتے ہیں جو عام انسانی تجربات سے بلند تر ہے، لیکن حقیقتاً یہ تجربہ بھی ایک انسانی ہی تجربہ رہتا ہے، جسے اس کی نفسیاتی اور وجودی حدود میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی ہو یا پیغمبر، دونوں اس روحانی واردات سے واپس پلٹ آتے ہیں، تاہم پیغمبر کی یہ بازگشت محض ذاتی روحانی تسکین نہیں رہتی بلکہ انسانی دنیا کے لیے لامحدود امکانات، انقلابی بصیرتوں اور نئے تمدنی و اخلاقی نظاموں کی نوید بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ اقبال، غزالی کی طرح فکر کو نارسا اور بے نتیجہ نہیں مانتے بل کہ اسے متحرک مانتے ہیں۔ جو بھی چیز متحرک ہے اس کی کوئی نہ کوئی منزل ہے اور اگر منزل نہ بھی ملے تو اس میں ترقی کے امکانات بالکل واضح ہوتے ہیں۔ اس پر علامہ اقبال نے فکر کی متناہیت اور لامتناہیت پر بڑی خوبصورت بحث قائم کی ہے۔ کوئی بھی لامتناہیت متناہیت کے بنا ممکن نہیں۔ فکر چوں کہ تحدید سے آزاد ہے اور اس پر پابندی ہرگز نہیں لگائی جا سکتی اس لیے اس کی اعلیٰ اقسام وجدان سے جا ملتی ہیں۔ گویا فکر جو صحیح سمت میں ہو، بشکلِ وجدان اس حقیقی کل کا

حصہ بھی بن سکتی ہے جو سب سے اعلیٰ وارفع ہے اور لوحِ محفوظ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

حضرت عمرِ فاروق کا سیکڑوں میل دور اپنے سپہ سالار کو "یا ساریہ الی الجبل" کہنا اور اس کو یہ الفاظ سننا جیسے بہت سے مافوق الفطرت واقعات علامہ صاحب کے اس دعوے کو تقویت بخشتے ہیں۔ درج ذیل حدیثِ قدسی کو مدنظر رکھا جائے تو علامہ صاحب کی بات سمجھ آنے لگتی ہے۔" اس حدیثِ قدسی میں ربِ کائنات اپنے مقرب بندوں کی شان بیان فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ نفل عبادات کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر اس کی حیات اس درجہ میری تجلیات کی مظہر بن جاتی ہے کہ اس کا سننا، دیکھنا، پکڑنا اور چلنا سب میرا ہی فیض بن جاتے ہیں۔ گویا اس کی سماعت میری سننے کی قوت سے، اس کی بصارت میری دیکھنے کی طاقت سے، اس کے ہاتھ میری قدرت سے اور اس کے قدم میری مشیت سے متحرک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انسان کی ذات اور الٰہی مشیت میں ایسا گہرا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی طلب اور میری عطا میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا؛ چنانچہ جب وہ کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں کہ اب اس کی دعا اس کی اپنی ذات کی آواز نہیں بلکہ میرے ارادے کی گونج بن جاتی ہے۔

آئین اسٹائن کے نظریہ کائنات نے چوں کہ طبیعیات کے حوالے سے دنیا میں بڑا انقلاب برپا کر دیا تھا اور اس میدان کی قدیم روایات متزلزل ہو گئی تھیں اس لیے کائنات کے اسرار و رموز کو نئے انداز سے دیکھنے کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ کائنات کی نئی تعبیر و تشریح یقیناً عوام اور خواص سبھی کے لیے دلچسپی کا باعث تھی، اس حوالے سے علامہ محمد اقبال قرآنِ مجید کا حقیقی مقصد انسان کے ذہن کو مابعد الطبیعیاتی معاملات میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے ایک برتر اور اعلیٰ شعور کی پرورش کی دعوت دیتے رہے۔ اس حوالے سے انھوں نے گوئٹے کا اسلام کے بارے میں یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں ہے اور ان کی اپنی تعلیمات ہی نہیں بل کہ دنیا کا کوئی بھی شخص اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

درحقیقت ان سارے مباحث کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے نظر انداز کردہ خزینے کی جانب توجہ دلانا چاہتے تھے۔ کائنات کی تعبیر و تشریح اور اپنے موقف کی تائید میں انھوں نے قرآنِ مجید کی متعدد آیات کو بھی بطور حوالہ پیش کیا ہے جن میں دن اور رات کی تبدیلی میں، کائنات کے بنانے میں، اور اس میں سیر کر کے مشاہدات کرنے اور ایسے دیگر مظاہر کے بارے میں غور و فکر کی دعوت کے ساتھ ساتھ اس کو مسخر کرنے کی جانب توجہ بھی دلائی گئی ہے۔ علامہ صاحب کے نظریات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی جامدیت کے بھی خلاف تھے۔

اسی حوالے سے انھوں نے اپنی شاعری میں بھی کائنات کی ناتمامی اور مسلسل آنے والی صدائے کن فیکون کا ذکر کیا ہے۔ خطبہ اول میں ایک اور اہم مسئلہ کائنات میں انسان کی حیثیت کا ہے۔ کائنات میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور اسے بہت سے

اختیارات دیے ہیں جن سے یہ اپنا جہان خود پیدا کرنے کی طاقت کا مستحق ٹھہر تا ہے۔ اسی لیے اسے چاہیے کہ ایسے اقدامات کرے جن کی بدولت کائنات کے سربستہ رازوں تک پہنچے اور اسے تسخیر کرنے میں آسانی ہو اور اگر اس میدان میں مشکلات در پیش ہوں تو اس صورت میں اپنی قوتِ ارادی کو بھی کام میں لانے کوشش کرے۔ ایسا نہ کرنے سے وہ روحانی تنزلی اور غلامی جیسے مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب اس پہلو میں چوں کہ علم و فہم و فراست کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے اس میں تفکر اور مشاہدہ عمق پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یعنی روحانی درجات کا سفر علم کی وجہ سے ہے، علم کا حصول حسیات کی وجہ سے اور عقل و فہم اس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ ایسی ہی انسانی کوششوں سے اس کی بصیرت تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان سب روحانی مراحل سے گزر کر انسان اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا قلب رواں ہو جاتا ہے اور اس میں انوارِ الٰہی کی تجلیات کا مشاہدہ ممکنات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ایسے بے شمار بزرگ گزرے ہیں جن سے کرامات کا ظہور ہوا ہے اور انھوں نے انوارِ الٰہی سے فیض یابی بھی کی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کہتے تھے کہ دنیا میری ہتھیلی پر ایک رائی کے دانے کی طرح ہے، وہ ایک ہی وقت چالیس مریدوں کے گھر پر بھی موجود ملتے تھے۔ حضرت بایزید بسطامی، شیخ جنید بغدادی اور ایسے بہت سے بزرگانِ دین کی ذات سے بہت سی ایسی کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے جو یقیناً قربِ الٰہی کے حصول کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

> "اگر فکر نارسا ہے اور وجدان ناقابل اعتبار ہے۔ اگر علم کا تعلق صرف مدرکات حواس سے ہے اور عمل محض انضباط ذات کا ایک ذریعہ، اگر یہ سب اپنے اپنے رنگ میں حقیقت کے ترجمان ہیں اور اس لیے ایک ہی راستے پر گامزن، یا سب نہیں، صرف ایک موثر ہے، باقی الاصل، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس مسئلے یا مسائل کا فیصلہ جو اس طرح پیدا ہو جاتے ہیں کس طرح کریں؟"(۱۷)

اقبال اب اپنے سوال کو دہراتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک جس جہان میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ جہان کسی تخلیقی کھیل کے نتیجے میں وجود میں نہیں لایا گیا۔ اپنے سوال کے جواب میں جو اصول انھوں نے قرآنی آیات کے حوالوں سے مرتب کیے ہیں، وہ مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:-

اقبال سگمنڈ فرائڈ جیسے ماہرین نفسیات کے اس نظریہ کو رد کرتے ہیں کہ مذہب محض افسانہ ہے۔ البتہ انھوں نے ہر اہم نکتہ کے حوالے سے خطبہ پر ہونے والے اعتراض کو بھی سامنے رکھا ہے اور اس کا جواب دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس میں سید نذیر نیازی، برہان احمد فاروقی اور الطاف احمد اعظمی جیسے ناقدین کے خطبات پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے تاکہ کوئی ابہام نہ رہ جائے۔ اس سلسلے پہلے خطے میں چودہ صفحات پر اعتراضات کے مدلل جوابات دیے گئے ہیں۔ چوں کہ خطبات کی تشریح میں علامہ اقبال نے وضاحتی اور دفاعی

طریقہ کار اختیار کیا ہے اس لیے اگر غور کیا جائے تو گیارہ صفحات پر اہم نکات کی وضاحت ہے اور اگلے چودہ صفحات محض اعتراضات کے حوالے سے موقوف ہیں جب کہ آخر میں اقبال کی زندگی کے مابعد الطبیعیاتی و ماورائی واقعات کا بیان ہے جس کے بعد چھتیس ۳۶ حوالہ جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس خطبے کی شرح کا آغاز انھی فلسفیانہ مسائل علم، حواس، معرفت اور سائنس سے کیا ہے جو خطبات میں پیش ہوئے۔ اس میں مذہب اور عقل کے رشتے پر زیادہ طویل بحث کی گئی ہے جس کے بعد جہاں جہاں کسی مبصر یا شارح کا کوئی اعتراض یا تحسین ضروری سمجھی، وہ بھی دی گئی ہے۔ اس شرح کو تفہیمِ خطبات کے سلسلے میں اہم سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

> "اقبال اور شیخ محی الدین ابن عربی کے مذکورہ خیالات میں کامل یکسانیت ہے اور دونوں ہی خیالات کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اقبال کی مغفرت کرے۔ خطبات میں کثرت سے ایسے خیالات ہیں جن پر واضح طور پر کفر و شرک کا اطلاق ہوتا ہے۔"(۱۸)

اسی کتاب کے پندرھویں صفحے پر اعتراض در اعتراض کا سلسلہ پہلی سطر سے ہی شروع ہو جاتا ہے جس میں لکھتے ہیں "اقبال یہ بات بھول گئے کہ انسانی فکر برابر بدلتی رہتی ہے۔۔۔ اس متغیر فکر کی روشنی میں اسلامی عقائد کی جو تاویل و تشریح کی جائے گی وہ یقیناً دیرپا ثابت نہ ہو گی"، "اسلامی تعلیمات کا ماخذ کسی انسان کا ذہن نہیں ہے بل کہ اس کا مصدر و ماخذ ذاتِ مطلق یعنی اللہ تعالیٰ ہے"، اقبال کے مطالعہ کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی عقائد بالخصوص ذاتِ باری تعالیٰ کے ادراک کا معتبر ذریعہ روحانی وجدان یعنی مذہبی تجربے کو قرار دیا ہے۔ اقبال کے مطالعے کی تیسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے قرآنِ مجید کی آیات سے استدلال کرتے وقت ان کے سیاق و سباق کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔" اعظمی صاحب کے اعتراضات اگر جاندار ہوتے تو یقیناً یہ مطالعہ اقبال میں کئی نئی جہات کا اضافہ کرتے ۔ ان کے اعتراضات کا نہ کوئی پس منظر ہے اور نہ ہی وہ جدید دنیا اور مسلمانوں کے مسائل کے حوالے سے کوئی حل پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ البتہ ان کے اعتراضات کے نتیجے میں خطبات کے مطالعے میں بڑی اہم پیش رفت ہوتی رہی ہے اور اس حوالے سے بڑے مدلل جوابات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ یعنی اس کتاب کی اہمیت اس کے رد کے طور پر خطبات کی شروح پر ہونے والا کام ہے۔

> "انھوں نے مشرق و مغرب کے قدیم و جدید مسلم اور غیر مسلم حکماء، فلاسفہ، صوفیا، ماہرینِ نفسیات اور علمائے سائنس کے افکار کو نظریات کو کھنگھالا، تنقیدی اور تجزیاتی شعور و ادراک کی روشنی میں ان کے صحت و سقم کو جانچا اور پرکھا اور پھر خذ ما صفا دع ما کدر کے مطابق ان کے عطر سے اپنے مذہبی فکر کا خاکہ مرتب کر کے قرآن و حدیث، اقوال و اعمال صحابہ، اور اکابر صوفیائے اسلام کے تجربات و مشاہدات سے اس کے لیے سند تصدیق و توثیق حاصل کی، اس بنا پر اس جدید علم کلام میں زیادہ پختگی، گیرائی اور گہرائی ہے اور وہ جدید انسان کی زبان اور اس کے طریق فہم سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔"(۱۹)

اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”ان خطبوں میں تقریباً سب ہی بنیادی اسلامی عقائد آ گئے ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ، وحی و رسالت، جبر و اختیار، تقدیر، لوحِ محفوظ، حیات بعد الموت، برزخ، جنت و جہنم اور نامہ اعمال وغیرہ سب کی اپنی مابعد الطبیعیاتی موقف سے تشریح ہے۔“(۲۰)

خلیفہ عبدالحکیم اقبالیات کے حوالے سے معتبر حوالہ ہیں، انھوں نے بھی خطباتِ اقبال کی شرح کی جو کوشش کی ہے وہ اس حوالے سے قابلِ قدر ہے کہ کم وقت میں قاری خطبات کے بنیادی مباحث سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب علامہ محمد اقبال کے خطبات کی تلخیص ہے اس لیے اس میں کسی بھی اسلامی تصور کی کوئی خاص وضاحت نہیں دی گئی، نہ ہی خطبات پر اعتراضات کا جواب ہے اور نہ ہی اس میں خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی جانب سے کچھ خاص اضافہ کیا ہے۔ یہ تلخیص اسباق یا لیکچرز کے انداز میں ہے جس میں خلیفہ عبدالحکیم ایک خطبے کو بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور اقبال کے خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے اس کا اختتام کر دیتے ہیں۔ حقیقتاً خلیفہ صاحب کی یہ کاوش نہ تو ترجمہ ہے اور نہ ہی تشریح۔ یہ ان دونوں کے بیچ کی وضاحت اور تلخیص ہے۔ اسلوب سادہ اور پرکشش ہے اور بیانیہ بھی سادگی ہی کا نمونہ ہے۔ خطبہ اول کی شرح کے حوالے سے وہ خطبہ اقبال ہی کو دوبارہ سے بیان کرتے ہیں اور علم، فلسفہ، وجدان کے موضوعات و مشکل تصورات کو آسان الفاظ میں اس طرح سے گوندھتے جاتے ہیں کہ قارئین کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

”فکر بھی کوئی ساکن چیز نہیں اس کے اندر حرکت ہے۔ فکر کے اندر بھی اسی طرح لامتناہی مضمر ہے جس طرح بیج کے اندر پورا درخت مکنون ہوتا ہے۔ فکر کے اندر بھی ایک باطنی کلیت ہے مرورِ زمان میں بتدریج ظاہر ہوتی ہے۔ ادراک اور احساس کا کوئی جزء کل سے بے تعلق ہو کر پوری طرح قابلِ فہم نہیں ہو سکتا۔“(۲۱)

خطبات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی شروح کو الگ الگ کتابی صورت دی جائے۔ ان شروح میں ڈاکٹر صاحب کا انداز استدلالی اور وضاحتی رہا ہے۔ وہ اقبال کے ایک خیال سے بحث کرتے ہیں جس سے قاری کے ذہن میں سوالات جنم لینے لگتے ہیں لیکن اگلی چند سطور میں ان سوالات کے جوابات بھی موجود ہوتے ہیں اور وضاحت کے لیے قرآنِ پاک، سائنس، فلسفہ اور روزمرہ زندگی سے امثال اور اقبال و دیگر شعرا کے اشعار بھی موجود ہوتے ہیں۔ اس سے ان خطبات کے تفہیم آسان تر ہو جاتی ہے۔ مثلاً خطبہ اوّل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فلسفہ کو اختیار ہے کہ مذہب کو موضوع بنائے اور عقلی معیار کی کسوٹی پر پرکھے لیکن یہ بھی مذہب کی اجازت سے مشروط ہے یعنی یہ مذہب کے اختیارات میں سے ہے کہ وہ فلسفے کو اپنی پرکھ کے لیے کتنے اختیارات دیتا ہے۔ یعنی اگر کوئی مذہبی حکم یا عبادت وغیرہ فلسفے کی رو سے

درست نہیں تو فلسفے کو اختیار نہیں کہ اس کے خلاف علم بغاوت اٹھالے۔ یہ سطور پڑھتے ہوئے قاری کے دماغ میں فلسفے اور مذہب سے متعلق مباحث جنم لینے لگتے ہیں اور وہ ان دونوں کے معیارات اور حقائق کو پرکھنے کی جستجو میں ہوتا ہے کہ اگلی سطور اس کی اس مشکل کو حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

> "فلسفہ کسی بھی عہد میں ذہنی ارتقا کے کسی ایک مرحلے کی انسانی عقلی کاوش کا نام ہے۔ جس میں اکملیت ہونا ضروری نہیں۔ کسی ایک دور میں جو مذہبی مسائل اور معاملات انسانی عقل کے لیے غیر مدرک اور ناقابلِ فہم ہوتے ہیں اگلے کسی دور میں ذہنی ارتقا کی بدولت مدرک اور قابلِ فہم بھی بن سکتے ہیں۔ گویا ایک عہد کے فلسفیانہ افکار دوسرے کسی عہد میں فکر و نظر اور عقل و دانش میں تغیر کے ساتھ ردوبدل کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ کسی بھی عہد کے فلسفیانہ افکار کو ایسی مطلق حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی کہ انھیں بلاخوفِ تردید مذہبی عقائد کے ردو قبولیت کا حتمی معیار قرار دیا جاسکے۔"(۲۲)

علامہ اقبال کے نزدیک مذہبی تجربہ دراصل ایک مکمل اور جامع ادراک ہوتا ہے۔ اس تجربے میں انسان پر وہ ماورائی حقائق اسی طرح منکشف ہوتے ہیں جیسے روزمرہ کے تجربات میں حسی حقائق ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح ہم آنکھ سے رنگ و شکل کو براہِ راست دیکھتے ہیں، اسی طرح مذہبی تجربے میں قلب وروح پر غیبی اور روحانی حقائق کا انکشاف براہ راست ہوتا ہے۔ اقبال اس تجربے کو وجدان کا نام دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں فکر اور وجدان ایک دوسرے کے متضاد یا مخالف نہیں بلکہ معاون ہیں۔ فکر، حقیقت کو تجزیہ کر کے جزئیات کی صورت میں سامنے لاتا ہے جبکہ وجدان اسی حقیقت کو مکمل اور کلی صورت میں ایک ہی لمحے میں مشاہدہ کرلیتا ہے۔ یوں وجدان حقیقت کا کل نگر ہوتا ہے اور فکر حقیقت کا جز نگر۔ علامہ اقبال کی نظر میں مذہبی تجربہ، جسے وہ روحانی وجدان بھی کہتے ہیں، سائنسی تجربے کی طرح ایک مستند ذریعۂ علم ہے۔ جس طرح سائنس میں مشاہدہ و تجربہ انسان کو مادی حقائق سے روشناس کراتے ہیں، بالکل اسی طرح مذہبی تجربہ انسان کو ماورائی حقائق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے نتائج اور اس کے حاصلات کو نظرانداز کرنا عقل و دانش کے خلاف ہے، کیونکہ یہ بھی علم ہی کی ایک حقیقی اور معتبر صورت ہے، جو انسان کی فکری اور روحانی تکمیل کرتی ہے۔

علامہ محمد اقبال کے خطبات کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے مذہبی مشاہدے کو انسانی شعور کی اعلیٰ ترین جہت قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی تجربہ یا مشاہدہ محض ایک وجدانی کیفیت یا باطنی واردات نہیں، بلکہ یہ حقیقتِ مطلقہ کی براہِ راست آگہی کا ذریعہ ہے۔ اقبال نے مذہبی مشاہدے کو سائنسی تجربے کی طرح معتبر علم کا ذریعہ قرار دے کر مغربی فلسفے کے اس نقطہ نظر کی تردید کی کہ مذہب صرف جذباتی سہارا یا نفسیاتی تسکین کا وسیلہ ہے۔ ان کے ہاں وجدان اور فکر ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی

تکمیل ہیں۔ مذہبی مشاہدہ جہاں کلی ادراک عطا کرتا ہے، وہیں فکر اس کلیت کی تفہیم اور اطلاق کو ممکن بناتی ہے۔

اقبال کا تصور مذہبی مشاہدہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان کا روحانی سفر کسی غیر حقیقی یا تصوراتی دنیا کی سیر نہیں بلکہ حقیقتِ مطلقہ سے قرب و اتصال کا عمیق ترین تجربہ ہے جو انسانی زندگی کو معنویت، اخلاقی عظمت اور تخلیقی قوت عطا کرتا ہے۔ ان کے خطبات اس شعور کو نہ صرف فلسفیانہ منطق فراہم کرتے ہیں بلکہ مذہب، سائنس اور فلسفے کے درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کرتے ہیں۔ یہ مطالعہ اس امر کی بھی شہادت دیتا ہے کہ اقبال نے مذہبی مشاہدے کو اسلامی فکر کے احیاء اور امت مسلمہ کی روحانی و تمدنی تجدید کی اساس قرار دیا۔ ان کا یہ پیغام آج کے مادہ پرست اور انتشار زدہ دور میں خاص طور پر رہنمائی کا منبع بن سکتا ہے کہ جب تک انسان حقیقت مطلقہ سے زندہ تعلق قائم نہیں کرتا، اس کی فکر و عمل ادھورے رہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. خضر یٰسین، مذہبی تجربہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۶ء)، ص: ۱۳
۲. محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، علم اور مذہبی تجربہ تحقیقی اور توضیحی مطالعہ (لاہور: میسرز دارالفکر، ۲۰۰۸ء)، ص: ۱
۳. جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص: ۵
۴. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص: ۷
۵. محمد شعیب، آفریدی، خطباتِ اقبال کی اردو تسہیل کتب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔ مقالہ: ایم فل۔ (شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء)، ص: ۱۳
۶. جاوید اقبال، ڈاکٹر، خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص: ۲۶
۷. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص: ۹
۸. محمد اقبال، کلیات اقبال اردو (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء)، ص: ۲۳۲
۹. محمد آصف اعوان، ڈاکٹر، علم اور مذہبی تجربہ تحقیقی اور توضیحی مطالعہ (لاہور: میسرز دارالفکر، ۲۰۰۸ء)، ص: ۱
۱۰. الطاف احمد، اعظمی، خطباتِ اقبال ایک مطالعہ (لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۵ء)، ص: ۱۲
۱۱. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص: ۴۳
۱۲. محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء)، ص: ۲۳۲

۱۳. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص:۴۵

۱۴. محمد عثمان، پروفیسر، مترجم، اسلامی فکر کی نئ تشکیل (لاہور: مکتبہ خلیل، جنوری ۲۰۰۵ء)، ص:۴۱

۱۵. ڈاکٹر محمد آصف اعوان، علم اور مذہبی تجربہ، تحقیقی اور توضیحی مطالعہ (لاہور: میسرز دارالفکر ۲۰۰۸ء)، ص:۱۲۲

۱۶. پروفیسر محمد عثمان، ”مفکر اسلامی کی تشکیل، ص:۴۳

۱۷. البخاری، فی کتاب الرقاق، باب: التواضع، رقم:۲۰۵۶۔

۱۸. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص:۴۹

۱۹. نذیر نیازی، سید، مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص:۴۹

۲۰. جاوید اقبال، ڈاکٹر، ”خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم“، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۳۵

۲۱. محمد عبد السلام خاں، ’افکارِ اقبال (نئ دہلی: مکتبہ جامعہ ۲۰۱۱ء), ص:۱۲۴

۲۲. عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، ”تلخیص خطباتِ اقبال“ (لاہور: بزمِ اقبال، جون ۱۹۸۸ء) ص ۱۴

References

1. Khizr, Yasin. Mazhabi Tajurba. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 2016, p. 13.
2. Muhammad Asif Awan. Ilm aur Mazhabi Tajurba: Tahqiqi aur Tauseehi Mutala'a. Lahore: Messrs Dar-ul-Fikr, 2008, p. 1.
3. Javaid Iqbal. Khutbat-e-Iqbal: Tasheel o Tafheem. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2016, p. 5.
4. Nazir Niazi, Syed, trans. Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya. Lahore: Bazm-e-Iqbal, 2012, p. 7.
5. Muhammad Shoaib Afridi. Khutbat-e-Iqbal ki Urdu Tasheel Kitabon ka Tahqiqi wa Tanqeedi Jaiza, M.Phil thesis, Allama Iqbal Open University, Islamabad, 2007, p. 13.
6. Iqbal, Javaid. Khutbat-e-Iqbal: Tasheel o Tafheem, 2008, p. 26.
7. Nazir Niazi, Syed, trans. Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, p. 9.
8. Muhammad Iqbal. Kulliyat-e-Iqbal (Urdu). Islamabad: National Book Foundation, 2016, p. 232.
9. Muhammad Asif Awan. Ilm aur Mazhabi Tajurba: Tahqiqi aur Tauseehi Mutala'a, p. 1.
10. Altaf Ahmad Azmi. Khutbat-e-Iqbal: Ek Mutala'a. Lahore: Dar-ut-Tazkeer, 2005, p. 12.
11. Nazir Niazi, Syed, trans. Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, p. 43.
12. Muhammad Iqbal. Kulliyat-e-Iqbal (Urdu), p. 232.
13. Ibid., p. 45.
14. Muhammad Usman, Prof., trans. Islami Fikr ki Nai Tashkeel. Lahore: Maktaba Khaleel, 2005, p. 41.
15. Muhammad Asif Awan. Ilm aur Mazhabi Tajurba: Tahqiqi aur Tauseehi Mutala'a, p. 122.
16. Muhammad Usman, Prof. Mufakkir Islami ki Tashkeel, p. 43.

Tahreer
Journal of Languages and Literature, Vol. 3 No. 2 (2025)

17. Al-Bukhari. Fi Kitab-ul-Raqaq, Bab: Tawazu‘, Hadith No. 2056.
18. Nazir Niazi, Syed, trans. Tashkeel-e-Jadeed Ilahiyat-e-Islamiya, p. 49.
19. Ibid.
20. Javaid Iqbal. Khutbat-e-Iqbal: Tasheel o Tafheem, p. 35.
21. Muhammad Abdul Salam Khan. Afkar-e-Iqbal. New Delhi: Maktaba Jamia, 2011, p. 124.
22. Khalifa Abdul Hakeem. Talkhees Khutbat-e-Iqbal. Lahore: Bazm-e-Iqbal, 1988, p. 14.